فلسفہ اور الہام و کشف

محمد ابو عمر عبد الشکور

غور و فکر کے لئے محدود و لامحدود دو ذریعے موجود ہیں۔ غیب و شہادت اور ظاہر و باطن کو عقل تسلیم کرتی ہے لیکن فلسفہ نے جو نظامات فکر مرتب و مدون کئے ان میں اس امر کو تسلیم کیا ہے اور اس پر اس کو بلا کسی استدلال کے اصرار ہے کہ حصول علم کے ذریعے صرف حواس خمسہ ہی ہیں اور ان کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں۔ اس لئے صرف وہی علم، علم کہلانے کا مستحق ہے جو حواس خمسہ سے ہم تک پہنچے اور اسی پر ہم یقین کر سکتے ہیں۔ اور کسی واسطے اور ذریعے سے ہم کو یقین حاصل نہیں ہو سکتا لیکن خود حواس خمسہ یقین کامل کی تعریف کا تعین نہیں کرتے۔

لامحدود کے تسلیم کرنے میں عقلی استدلالات تین قسم کے ہیں۔ اول علت کونی دوئم علت غائی اور سوئم علت وجودی۔ پہلے دو کے ذریعوں کو محدود تک رسائی نہیں بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ لامحدودیت کو جاری رہنا چاہیے۔ یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ وہ اس طرح کہ ہر معلول کی ایک علت ہے اور ہر علت کے لئے کوئی اور دوسری علت۔ اسی طرح یہ لامتناہی سلسلہ جاری رہے گا۔ ختم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے لامحدودیت ہمیشہ سے قائم ہے۔ اسی طرح ہر معلول مستقبل کے لئے علت ہے اور یہ معلولات اپنی فعلیتوں میں ختم نہیں ہوں گے۔ یعنی مستقبل میں بھی لامحدودیت ہو گی درمیانی تمام تعینات توانائی اور حرکات و سکنات اور اشکال ہیں اور ان سے مخصوص صفات و خواص کا اظہار ہوتا ہے جن سے دوسرے تعینات استفادہ کرتے اور دوسروں کے لئے مفید بنتے ہیں یعنی مجرد توانائی کے ساتھ ساتھ چند خواص و صفات کا بھی وجود پایا جاتا ہے۔ اور یہ جداگانہ فعلیتیں مختلف نوعیتوں کی ہوتی ہیں جن سے کائنات میں حیات کی پیدائش اور پھر اس حیات کا ارتقاء جاری ہے۔ لیکن اس کل نظام میں غایات و مقاصد موجود ہیں۔ جن کی وجہ سے اس تمام کائنات و

حیات کا ارتقاء ایک خاص سمت میں ہے۔ اور یہ نظام مسخود و مسخر و مغلوب اور محکوم ہوتا ہے۔ اور انسان کی انا ہی ہے جو اس کو مسخر کر رہی ہے۔ فلسفیانہ نظامات میں اس قسم کی مرکزیت کے قیام کو علت غائی کہا جاتا ہے۔ لیکن تمام فلسفیانہ نظامات اس کائنات و حیات کے تسلسل میں جب انا ء انسانی کے مقام پر پہنچتے ہیں تو ان کی فکر کی دوڑ ختم ہو جاتی ہے اور خود فلسفہ اس کائنات و حیات کے مقصود انسانی انا پر پہنچ کر اس وحدت آشنائی پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور پھر انسانی کثرت تخلیق کے مسائل میں الجھ کر انسانی عالم کی توحیدیا غایت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور طبعی فلسفہ اپنا نام تبدیل کر کے مابعد الطبعی فلسفہ کہلاتا ہے اور خود فکر کا ارتقا ہو جاتا ہے۔ اس مابعد الطبعی فلسفہ میں انسانی انا کے اقدار میں اس کی حیات ابدی و حیات عارضی اور حیوانی سطح حیات سے انسانی حیات کا امتیاز معرض بحث میں آجاتا ہے۔ تو فلسفیانہ فکر کے لئے یہ ضروری امر ہے کہ وہ عالم انسانی کے ان پیچیدہ مسائل کو حل کرے جو اس کی عمرانیات تمدن و تاریخ سے پیدا ہو کر افراد اور اقوام کو مضطرب و پریشان رکھتے ہیں۔

اس منزل پر پہنچ کر پھر فکر کا رخ بدل جاتا ہے اور وہ یہ سوچنے اور اس پر غور کرنے کے لئے مجبور ہوتی ہے، اور تخیل، تصور، التفات، ارادہ سے کام لے کر ایک دوسری راہ پر چل پڑتی ہے کہ شاید اس راستہ سے وہ حیات ابدی تک پہنچ جائے۔ تاریخ انسانی میں اقوام اور ان کے معاشروں کی داغ بیل میں کچھ ایسے حقائق پوشیدہ ہیں کہ افلاطون یہ کہنے پر مجبور ہوا اور اپنے استاد سقراط کے نظریہ فکر سے انحراف کرتے ہوئے اس نظریہ فکر کو پیش کیا تھا کہ طبیعات کی راہ سے حاصل شدہ علم کے لئے ایک اور راہ عوام اور ان کے رسم و رواج کے عقب میں پائی جاتی ہے اور اس کے ذریعہ سے ہم کسی اخلاقیات کے جامع اصول اور دستور و آئین کو معلوم کر سکتے ہیں۔ اس طرح افلاطون نے علم کا دوسرا ذریعہ علم طبیعات کے علاوہ انسانی تمدن و تہذیب اور علم تاریخ کو قرار دے دیا تھا اس کے نظام فکر نے اس راہ پر تصورات سے کام لیا۔

اگر چہ افلاطون کے زمانہ میں بھی عالم نبوت ووحی کا چرچا اور شہرت موجود تھی۔لیکن اس نے اس طرف التفات نہیں کیا بلکہ معاشروں ہی کے تجربات ومشاہدات پر زور دیا جن کے حقائق دریافت کرنے کے لئے اس نے فکر کے رخ کو بدل دیا۔وہ عالم طبیعات کے بجائے تمدن حیاتیاتی عالم یعنی ایک مابعد الطبیعاتی عالم تھا۔اس کی فکر اور اس کے حواس خمسہ ہی محدود معاملات کا مشاہدہ وتجربہ کرنے کے لئے کام آرہے تھے۔لیکن تخیل،تصور،حافظہ،میلانات،ارادہ میں عالم طبیعات کی بجائے عالم تمدن وسیاست اس کا مطمح نظر اور موضوع فکر تھا اور اس نے اخلاقیات کے لئے تصورات کو اہمیت دی،اور عقول عشرہ کا ایک مکمل نظام دنیا کے روارد جس میں ارض وسماوات اور ان کے مابین تعلقات سے انسانی اخلاقیات اور اس کی حیات کو متعین کرنے کی کوشش کی،اور روح میں عقل اور معقولات عشرہ کے مقام کو پیش کیا۔اس کائنات میں انسانی مقام ومرتبہ کو اعلیٰ ترین ثابت کیا لیکن کائنات سے علیحدہ ہی کو انسان کی دائمی مسرتوں کا ذریعہ قرار دیا۔اس کے نتیجہ میں عالم طبیعات کے وہ تمام تحقیقات جو حکمائے یونان نے اس سے قبل انجام دیئے تھے اس کی تعلیمات کی اثر اندازیوں سے قوم نے اس طبیعاتی رخ پر فکر کی جدوجہد کو کم کر دیا جس کے نتیجہ میں تسخیری کام کمزور ہو گئے اور رفتہ رفتہ فکر کے ایک رخ کے کمزور ہونے سے ساری قوم پر کمزوری طاری ہوتی چلی گئی اور اس کا ظاہر رو بہ زوال ہوتا ہوا دنیا میں کمزور ہوتا چلا گیا۔لیکن حکمائے یونان کے مختلف نظام فکر باقی رہے۔اور ان انسانوں کو جو ان نظامات فکر پر غور وخوض کرتے ہیں اسی قسم کی زندگی تسخیر کائنات یا استحکام تمدن کے لئے حاصل ہوتی ہے۔ان تمام پہلوؤں کے مشاہدہ وتجربہ سے پھر اس امر کا اظہار ہوا کہ تمام رخوں پر فکر انسانی کو جاری رہنا چاہیے۔لیکن ان تمام طریقوں سے انسانی ابدی حیات کے حصول کے مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اور نہ خدا اور آخرت کا کوئی تصور پیدا ہوتا ہے۔

عالم فطرت و عالم تاریخ کے بعد تیسرا عالم ہمارے فکر کا محل و مقام نبوت و وحی ہو سکتا ہے جو عوام کی اکثریت کے اعتقاد میں شامل ہے اور جن پر تقلیدی طور پر ہر قوم کی اکثریت عمل کرتی چلی آتی ہے۔

عالم نبوت اور وحی بھی ایک عرصہ دراز سے فکر کا موضوع بنا ہوا ہے جس کو ہم الہیات کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہر فکری و عملی دائرہ کی یہ خصوصیت بھی نفسیاتی طور پر یوں ظاہر ہوتی ہے کہ ہر علم و فن کے علمبردار اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دیتے اور اپنی بقاء کا سامان کرتے ہیں۔ اس طرح گویا علوم کے منکشف ہونے کے ساتھ ہر قسم کے دائروں میں یہ تصور، تخیل، فکر، التفات و ارادہ خاص نوعیت سے اپنی زندگی کو باقی رکھتے ہیں اور نفس انسانی خود بخود حیوانی سطح سے بلند ہو کر تحقیقی اور ذوقی دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے اور اپنی جان و مال کو اس تحقیقی مقصد کے حصول میں قربان کر دیتا ہے۔ ان تصورات و تخیلات اور التفات و ارادوں سے مختلف قوموں میں اجتماعی نفس کی تشکیل ہوتی ہے اور حیوانی نفس ادنیٰ اس راہ پر چل کر اس حیوانی نفس کی تشکیل ہوتی ہے اور حیوانی نفس اس راہ پر چل کر اس حیوانی نفس کی قربانی کرتا ہوا اپنے نفس کی حیوانی نوعیت کو بدلتا رہتا ہے اور حیوانی سطح کے طبعی خیر و شر کو اس منزل پر کوئی اہمیت نہیں دیتا اور خاطر میں نہیں لاتا۔

ہر دور میں پیدا ہونے والی نسل، ہر قوم، ابتدائی حیوانی حیات کو لئے ہوئے پیدا ہوتی ہے، اور ساتھ ہی انسانی کامل فطرت اور عقل و شعور بھی اس میں خوابیدہ اور بالقوہ موجود ہوتے ہیں، لیکن ہر قوم اپنے اپنے نظریہ کے تحت نئی نسل کے ذہن کو اسی تصور و تخیل و فکر و ارادہ پر ڈھال لیتے ہیں جو ان کے پیش نظر ہوتا ہے اور اس میں اس قدر شدت ہوتی ہے کہ اقوام عالم کی اکثریت اسی پر گامزن ہے۔ لیکن ہر ابھرنے والی نسل کا ہر فرد اس ماحول کی اثر اندازیوں اور مکمل تسلط کے باوجود داخلی حیثیت سے طبعی خیر و شر اور اخلاقی خیر و شر کے تضادات سے ان تمام نظامات کو خارج

اوران کی اثر اندازیوں سے قطع نظر کر کے باطنی طور پر اس خیروشر کی آماج گاہ سے اپنی نجات چاہتا ہے۔ یہ راہ بغیر اس ماحول و معاشرہ کے اس کو حاصل نہیں ہوسکتی جو اس طبعی خیروشر اور اخلاقی خیروشر کی لذتوں ومسرتوں اوران کی اذیتوں سے بلند وبالا ہو کر کسی ایسی ہستی کو نہ مانے جو واقعی ان طبعی خیروشر اور اخلاقی خیروشر سے بلند وبالا قادر مطلق کی حیثیت سے صمدیت پر فائز نہ ہو، اور کوئی جو اس امر کی تلاش میں ہے وہ اس سے ہم آغوش نہ ہو جائے۔ آخرہ پناہ گاہ انائے انسانی کے لئے یہی پناہ گاہ ہے۔ اسی کی فطرت انسانی کو تلاش ہے۔

دنیا میں طبعی خیروشر اور انسانی اجتماعات میں اخلاق خیروشر کے حقائق کی وضاحت انسانی زندگی کے مختلف مراحل پر اس کے عقل وشعور و احساسات اور تصورات کے تحت مختلف ہوتی ہے اس لئے مختلف اقوام میں مختلف مذاہب اور مختلف نظریات کی روشنی میں اس پر عمل درآمد کے لئے تعلیمی وتربیتی نظام مرتب ومدون ہوئے ہیں، اور ہر قوم انہیں نظامات سے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنا کام انجام دیتی ہے، لیکن ان تمام فکری پابندیوں اور نظامات کے دباؤ کے باوجود ہر انسان کی فطرت آزاد ہے اور وہ اپنی راہ آپ مقرر کرسکتا ہے۔ اس کے لئے وہ تمام سے کٹ کر اپنے اخلاق وکردار اور سیرت سازی کا خود ذمہ دار ہے، وہ تکوینی نظام میں مجبور ہے اور تمدنی وقومی نظامات میں مجبور نہیں۔ یہ اختیار اس کو اس کے اپنی ہی ذاتی علم وعمل کی قوتوں کے درمیان حاصل ہے۔ جس کو وہ خیر سمجھتا ہے اسی کو انجام دے، جس کو وہ شر سمجھتا ہے اس کو ترک کردے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ خود گرفتار بلا ہوگا، چنانچہ تمام مذاہب نے اس آزادی واختیار کو تسلیم کیا ہے، اور نظامات فکر نے بھی اس کی وضاحت کی ہے۔ انسان اپنے ہی علم اور اپنے عمل کے درمیان واضح فرق رکھتا ہے۔ نہ اس کا علم حیوانی جبلت کی طرح طبعی ہے، نہ اس کا عمل حیوانی عمل کی طرح جبلی طور پر سرزد ہوتا ہے، بلکہ عقل ہی فیصلہ کرنے والی ہے اور اس کا عمل

اپنے علم کا پابند ہوگا۔ اس کے علم کے ماخذ عالم فطرت، عالم تاریخ اور عالم نبوت و وحی ہیں جو اب تک تاریخی حیثیت سے محفوظ چلے آرہے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ نبوت و وحی کا محفوظ علم جو اقوام عالم کے مذاہب میں پایا جاتا ہے وہ تو کہہ اے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں کہ بندگی نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہراویں اس کا کسی کو، اور نہ بنادے کوئی کسی کو رب سوا اللہ کے، پھر اگر وہ قبول نہ کریں تو کہہ دو گواہ رہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں (پارہ 3، رکوع 14)

اور یہی وہ واحد علاج ہے جو ہر نفس انسانی کے تمام امراض کا علاج ہے، اور اس کے ذریعہ وہ اپنے علم و عمل کے درمیان موافقت پیدا کرسکتا ہے کہ وہ اللہ کے رو برو ہو کر اس کے اپنے علم و عمل کے درمیان منافقت کو ترک کردے، وہ کسی اور انسان کے پاس اس امر کے لئے جوابدہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے ہی ازلے کامل کے سامنے جوابدہ ہے۔

اگر کوئی اس صلاحیت کو ختم کرچکا ہے تو وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانی حیات میں گرفتار ہے، اور اس کے لئے موت وحیات وہی ہیں جو حیوانی موت وحیات ہیں۔ یعنی اس کے لئے دائمی جہنمی زندگی ہے کہ وہ اس حیوانی موت وحیات سے نہیں نکل سکے گا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے لا یموت والا یحییٰ (یعنی نہ وہ مرتا ہے اور نہ ہی زندہ رہتا ہے) اور جو اس علم و عمل کے درمیان تمیز کر کے اپنے ہی علم فطرت پر چلے گا وہ موت وحیات حیوانی سے بلند ہو کر دائمی انسانی زندگی حاصل کرے گا، اور اس کا دوام بھی عالم انسانی کی اس قسم کی دائمی حیات رکھنے والوں کے ساتھ مربوط ہو گا، اور یہی اس کی جنت ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا (یعنی ایسی جنت ہوگی جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا)

اس لئے عقل اور نبوت و وحی ایک دوسرے کے مددگار و معاون ہیں نہ کہ ایک دوسرے سے متضاد و مخالف اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے علم و عمل کے فرق کو دور کر دیں۔ ہم کو جواب اس ہستی کے روبرو دینا ہے جس کے نزدیک علم و عمل میں تفریق نہیں ہے اور وہی کائنات کے علم و عمل کا سرچشمہ ہے اور انسان اس کے تخلیقی معروض کی حیثیت سے اس منصب پر فائز ہے کہ وہ اپنے اختیاری حصولی علم و عمل میں مطابقت پیدا کرے اور اس کی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس (ذات باری تعالیٰ) نے اس محدود علم کے بالمقابل جو کائنات کے مشاہدہ و تجربات سے حاصل ہوتا ہے، ایک لامحدود علم کا سرچشمہ نبوت و وحی کی حیثیت سے بھی اس کو دیا تاکہ اپنی کمزور عقل کی وجہ سے اپنے آپ کو معذور نہ سمجھے۔